میر تقی میرؔ کی شاعری کا فنی و فکری جائزہ۔

ہر شاعر اپنے ماحول کی پیداوار ہوتا ہے۔ اس کے
ارد گرد رونما ہونے والے واقعات، حادثات، اس کی
ذاتی زندگی میں پیش آنے والے تجربات اور اس سلسلے
میں اس کے تاثرات ہی دراصل اس کی شاعری اور فن
کے رخ کا تعین کرنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔
ماحول اور معاشرے کی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ

Scanned with CamScanner

لاشعوری طور پر شاعر اپنی فکر کا رخ موڑتا چلا جاتا ہے اور یوں اس کی شاعری وقت کی رفتار کے ساتھ بدلتی رہتی ہے۔ میر تقی میر ایک ایسے عہد میں پیدا ہوئے جو سیاسی، سماجی، ملکی اور معاشی اعتبار سے سخت انتشار اور افراتفری کا دور تھا۔ مغل مرکز کمزور پڑ چکا تھا۔ ہندوستان کے بیشتر صوبے خود مختار ہو چکے تھے پورا ملک لوٹ مار کا شکار تھا۔ بیرونی حملہ آور آئے دن حملے کرتے تھے اور عوام و خواص کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیتے لوگ بھوکے مرنے لگے اور دولت لٹنے سے اقتصادی بدحالی کا دور شروع ہوا۔ میر اپنے اس دور کے احساس زوال اور انسانی الم کے مظہر ہیں۔ ان کی شاعری اس تمام شکست و ریخت کے خلاف ایک غیر منظم احتجاج ہے۔ میر کے تصور غم کے بارے میں ڈاکٹر سید عبداللہ فرماتے ہیں:

"میر کا سب سے بڑا مضمون شاعری
ان کا غم ہے۔ غم و الم کو میر کے
مضامین شاعری میں سب سے
زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ یہ غم
میر کا ذاتی غم بھی تھا اور یہی
انسان کی ازلی اور ابدی

تقدیر کا غم بھی تھا۔ یہ سارے غم میر
کی شاعری میں جمع ہو گئے ہیں۔"

غم و حزن

میر کا تصورِ زندگی کے بارے میں بڑا واضح ہے کہ ان کا زندگی کے بارے میں نقطۂ نظر حزنیہ تھا۔ حزن ایک ایسے غم کا نام ہے جو اپنے اندر تفکر اور تخلیقی صلاحیتیں بھی رکھتا ہے۔ یہ غم ذاتی مفاد اور ذاتی اغراض کا پرتو نہیں رکھتا۔ اس غم میں تو سوچ، غور و فکر اور تفکر کو دخل ہے۔ میر کے متعلق یہ کہنا بھی درست نہیں کہ میر قنوطی (مایوس کن) شاعر ہیں یا محض یاسیت (ناامیدی) کا شکار ہیں۔ محض یاس کا شاعر ہونا کوئی بڑی بات نہیں۔ اصل بات تو یہ ہے کہ انسان یاس و غم کا شکار ہونے کے باوجود زندگی سے نباہ کیسے کرتا ہے۔ یہی نباہ اس کا تصورِ زندگی کی تشکیل دیتا ہے۔ میر کا تصورِ زندگی مایوس کن نہیں صرف اس میں غم و الم کا ذکر بہت زیادہ ہے۔ مگر یہ غم و الم ہمیں زندگی سے نفرت نہیں سکھاتا

بلکہ زندہ رہنے کا حوصلہ عطا کرتا ہے۔ اس میں زندگی کی بھرپور توانائی کا احساس ہوتا ہے۔

۲۔ مجھ کو شاعر نہ کہو میر کہ صاحب میں نے
درد و غم کتنے کیے جمع تو دیوان کیا

۳۔ چشم رہتی ہے اب پُر آب بہت
دل کو میرے ہے اضطراب بہت

۴۔ متصل روتے رہیے تو بجھے آتشِ دل
ایک دو اشک تو اور آگ لگا دیتے ہیں

میر کا تصورِ غم

میر کا تصورِ غم تخیلی اور فکری ہے۔ یہ قنوطیت پیدا نہیں کرتا۔ اس کے ہوتے ہوئے میر کی شاعری میں توازن اور ٹھہراؤ نظر آتا ہے۔ شکستگی کا احساس نہیں ہوتا اور ضبط، سنجیدگی اور تحمل ملتا ہے۔ وہ غم سے سرشار ہو کر اسے سرور اور نشاط بنا دیتے ہیں۔ مجنوں گورکھپوری ان کے تصوراتِ غم سے بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"میر نے غم عشق اور اس کے ساتھ
غم زندگی کو ہمارے لیے راحت
بنا دیا ہے۔ وہ درد کو ایک سرور
اور الم کو ایک نشاط بنا دیتے
ہیں۔ میر کے کلام کے مطالعہ سے
ہمارے جذبات و خیالات اور
ہمارے احساسات و نظریات
میں وہ ضبط اور سنجیدگی پیدا
ہوتی ہے جس کو اصلی معنوں
میں تحمل کہتے ہیں"۔ ~~یہ صحیح عنوں~~

میر کی دردمندی

میر کے ہاں دردمندی ان کے فلسفہ غم کا دوسرا نام ہے۔ اگرچہ لفظ فلسفہ انہوں نے استعمال ہی نہیں کیا۔

مگر اس سے مراد ان کی یہی ہے۔ دردمندی سے
مراد زندگی کی تلخ حقیقتوں کا اعتراف و ادراک
مقدور بھر ان تلخیوں کو دور کرنے کی کوشش کا نام ہے
ہر درد مند دل ان کی زندگی سے تضادات سے جنم لیتی ہے
درد مندی کا سرچشمہ دل ہے۔ میر کے یہ اشعار دیکھیے
میں دیکھیے:

آبلے کی طرح ٹھیس لگی پھوٹ بہے
درد مندی میں کٹی ساری جوانی اپنی

نہ درد مندی سے یہ راہ تم چلے ورنہ
قدم قدم پہ تھی یاں جائے نالہ و فریاد

چشم رہتی ہے اب پُر آب بہت
دل کو میرے ہے اضطراب بہت

اشک آنکھوں میں کب نہیں آتا
لہو دل میں آتا ہے جب نہیں آتا

درد مندی کے محرکات

میر کا دور شدید ابتری کا دور تھا۔ زندگی
کے مختلف دائروں کی اقدار کی بے حرمتی ہو رہی
تھی۔ انسانی خون کی ارزانی، دنیا کی بے ثباتی اور

ہمہ گیر انسانی تباہی نے انسانوں کو بے حد متاثر کیا۔
میر اس تباہی کے محض تماشائی نہ تھے بلکہ وہ خود اس
تباہ حال معاشرے کے ایک رکن تھے۔ جو صدیوں سے
لگے بندھے نظام کی بربادی سے تسبیح کے دانوں کی
طرح بکھر کر رہ گیا تھا۔ اور اب اسکو جوڑنا ممکن نہ
رہا تھا۔ میر نے اس ماحول کے اثرات شدت سے
محسوس کیے ہیں۔ ان کی غزلوں میں اس تباہی کے
نقوش ملتے ہیں۔ لٹے ہوئے نگروں، شہروں اور
اجڑی ہوئی بستیوں کے حالات، بجھے ہوئے دلوں کی
تصویریں، زمانے کے گرد و غبار کی دھندلاہٹیں،
تشبیہوں اور استعاروں کی شکل میں میر کے ہاں موجود
ہیں:

روشن ہے اس طرح دلِ ویراں میں داغ ایک
اجڑے نگر میں جیسے جلے ہے چراغ ایک

پتا پتا بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے۔

دل کی ویرانی کا کیا مذکور
یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا

Scanned with CamScanner

بلند حوصلگی

بقول ڈاکٹر سید عبد اللہ :

"میر کو زندگی سے بیزار شاعر نہیں کہا جا سکتا۔ ان کا غم بعد میں آنے والے سب شاعر، فانی کے غم سے مختلف ہے جس کی تان ہمیشہ موت پر ٹوٹتی ہے۔ ان کا غم سودا سے بھی مختلف ہے۔ ان کا غم ایک مہذب اور درد مند آدمی کا غم ہے جو زندگی کے تضاد کو گہرے طور سے محسوس کرتا ہے کہ ایسی دلکش جگہ اور اتنی بے بنیاد اور محروم۔" ⊛

غم والم کے اس عالم میں میر بے حوصلہ نہیں ہوتے۔ وہ سپاہیانہ دم خم رکھتے ہیں۔ فوجی ساز و سامان کے استعاروں میں مطلب ادا کر کے زندگی کا ایسا احساس دلاتے ہیں جس میں بزدلی بہر حال عیب ہے۔ وہ رویہ جسے اہل تذکرہ بے دماغی یا بد دماغی کہتے ہیں وہ دراصل وہ احتجاجی روش ہے جو بے سپاہی کا

شیوہ ہے:

ع خوش رہا جب تلک رہا جیتا
میر معلوم ہے قلندر تھا

ع بہت آرزو تھی گلی کی تیری
سویاں سے لہو میں نہا کر چلے

ع حوصلہ شرطِ عشق ہے ورنہ
بات کا کس کو ڈھب نہیں آتا

دنیا کی بے ثباتی

بے ثباتی دنیا کا احساس اردو شاعری میں بہت عام ہے۔ اس موضوع پر تقریباً سبھی شعراء نے طبع آزمائی کی ہے۔ لیکن دبستان دہلی کے شعراء کے ہاں بے ثباتی کا احساس زیادہ گہرا نظر آتا ہے۔ خصوصاً میر تقی میر کی تمام شاعری میں دنیا کی بے ثباتی کا ذکر بڑے واضح الفاظ میں ملتا ہے جس کی اصل وجہ اس دور کے غیر یقینی اور ہنگامی حالات تھے جس کی وجہ سے ان کی شاعری میں دنیا سے بیزاری اور بے ثباتی کے موضوعات پروان چڑھے۔:

ع کہا میں نے کتنا ہے گل کا ثبات
کلی نے یہ سن کر تبسم کیا

غرور کر کے وہیں بحرِ نجم میں بیٹھ گیا
کہے تو پھر اک بلبلا تھا پانی کا ٧

جس سر کو غرور آج ہے یاں تاج وری کا
کل اس پہ یہیں شور ہے پھر نوحہ گری کا ٨

دلی کی بربادی کا غم

بقول ڈاکٹر غلام حسن:

"شاعروں نے دل کے استعارے میں اس عہد کے سیاسی اور سماجی احوال کو ~~اس عہد~~ سمو کر بڑے بلیغ کنایے سے کام لیا ہے۔ جس طرح انسانی جسم کی ساری نقل و حرکت کا مرکز و محور دل ہوتا ہے اسی طرح ایک سلطنت کا مرکز و محور اس کا دارالحکومت ہوتا ہے۔ زیرِ نظر دور میں ہندوستان کا مرکز سلطنت شہر دلی تھا۔ دلی جو صدیوں سے اس ملک کے دل کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ دلی کی تباہی کو شاعروں نے گویا دل کی ویرانی و بربادی سے تشبیہ دے کر سارے جسم یعنی کل ملک کی تباہی کی داستان بیان کی ہے۔"

میر نے دوسرے شعراء کی طرح یہ تمام خونی واقعات اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ میر کی شاعری پر خون کے یہ دھبے آج تک نمایاں ہیں۔

۱۔ دلی کے نہ تھے کوچے، اوراقِ مصور تھے
جو شکل نظر آئی ~~[illegible]~~ تصویر نظر آئی

۲۔ خاک بھی سر پر ڈالنے کو نہیں
کس خرابے میں ہم ہوئے آباد

۳۔ دلی میں آج بھیک بھی ملتی نہیں انہیں
تھا کل تلک دماغ جنہیں تاج و تخت کا

سادگی، خلوص، صداقت

میر نے فنی خلوص کو پوری صداقت سے استعمال کیا ہے۔ فنی خلوص سے مراد یہ ہے کہ شاعر زندگی کے واقعات کو جس طرح دیکھتا ہے۔ اسی طرح بیان کرے۔ میر کا انداز اسی لیے مقبول ہے کہ اس میں صداقت اور خلوص اور تمام باتیں بے تکلفی کے انداز میں کہی گئی ہیں۔ میر نے خیال بند شاعروں کی سی معنی آفرینی سے کام نہیں لیا۔ محض تخیل کے گھوڑے نہیں دوڑائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میر عوام کا شاعر ہے۔ اس کے آس پاس کی زندگی

PTO

سے در حقیقت غم کے مضامین کے چشمے ابل رہے تھے۔ میر نے انہی مضامین کو سادہ الفاظ میں بے تکلف انداز میں پیش کیا۔ میر کے خلوص و صداقت کا اندازہ ان اشعار سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ :

ء
قدر رکھتی نہ تھی متاعِ دل
سارے عالم کو میں دکھا لایا

ء
دل مجھے اس گلی میں لے جا کر
اور بھی خاک میں ملا لایا

ء
ابتداء ہی میں مر گئے سب یار
عشق کی کون انتہا لایا

خطابیہ انداز

میر کو خطاب اور گفتگو کا انداز بڑا پسند ہے۔ کبھی وہ خود سے مخاطب ہو کر "باتیں" کرتے ہیں اور کبھی کسی دوسرے شخص سے۔ کبھی ان کا مخاطب بلبل ہوتا ہے اور کبھی شمع و پروانہ سے۔ ان تمام حالتوں میں شعر میں بات چیت اور بے تکلفی کا رنگ بہر حال قائم رہتا ہے۔ ایک مانوس اور محبت بھری آواز کانوں سے ٹکراتی ہے جو اپنے پیرایہ ادا کی کشش

PTO

سے قاری یا سامع کو فوراً اپنے حلقہ اثر میں لے لیتی ہے اور وہ خود بخود میر صاحب کی ان بے ساختہ اور پرخلوص "باتوں" سے لطف اندوز ہونے لگتا ہے۔

چلتے ہو تو چمن کو چلیے سنتے ہیں کہ بہاراں ہے
پات ہرے ہیں پھول کھلے ہیں کم کم بادو باراں ہے

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا
آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا

ہیں جو بولا کہا کہ یہ آواز
اسی خانہ خراب کی سی ہے

بارے دنیا میں رہو غمزدہ یا شاد رہو
ایسا کچھ کر کے چلو یاں کہ بہت یاد رہو

میر کا طنز

میر کا طنز ان کی طبیعت کا آئینہ ہے۔ جب کوئی بات طنز کے ساتھ کہتے ہیں تو اس سے محض بے تکلفی نہیں ٹپکتی بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس عالم یا اس تجربے سے گزر چکے ہیں۔ ان کا طنز اس شدید اور عمیق تعلق کا نتیجہ ہے جو بے تکلفی کے بعد ہی پیدا ہوتا ہے اور پھر عمر بھر قائم رہتا ہے۔

ان کے طنز میں ایک مدھم سی تلخی ہوتی ہے جو پختہ مغزی کی علامت ہوتی ہے۔ ان کے طنز میں غالب کی تیزی کی جگہ ایک عجیب پر کیف نرمی ہوتی ہے۔

ہوگا کسی دیوار کے سائے تلے میر
کیا کام محبت سے اس آرام طلب کو

عشق کو شہ پر اس پری رو سے
میر صاحب بھی کیا دوانے ہیں

حال بد گفتنی نہیں میرا
تم نے پوچھا تو مہربانی ہے

تشبیہات و استعارات

میر نے اپنے شیوہ گفتار کو زیادہ موثر اور دلکش بنانے کیلئے تشبیہ و استعارے کا بڑے سلیقے سے استعمال کیا ہے۔ یہ تشبیہات مردہ نہیں بلکہ ان کے اندر زندگی دوڑتی ہوئی نظر آتی ہے اس لیے ان کے خالق کے خون میں گرمی اور حرارت ہے اور وہ پوری صداقت اور پورے فنی خلوص سے اپنی زندگی بھر کے تجربات و تاثرات کو ان تشبیہات و

استعارات کی صورت میں پیش کر رہا ہے۔ ان میں کہیں بھی تصنع یا بناوٹ کا احساس تک نہیں ہوتا۔

شام ہی سے بجھا سا رہتا ہے
دل ہوا ہے چراغ مفلس کا

نازکی اسکی لب کی کیا کہیے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

میر ان نیم باز آنکھوں میں
ساری مستی شراب کی سی ہے

کھلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے
اُس کی آنکھوں کی نیم خوابی سے

بس اے میر مژگاں سے پونچھ آنسوؤں کو
تو کب تک یہ موتی پروتا رہے گا

ترنم اور موسیقی / موسیقیت

میر کے شاعرانہ انداز کی غنائیت اور موسیقیت اپنے اندر فنی دلکشی کے بہت سے پہلو رکھتی ہے۔ میر کے انداز کی نغمگی اور ترنم مسلم ہے اور یہی میر کی عظمت کا راز ہے۔ ان کا کمال فن یہ ہے کہ وہ مختلف خیالات کے اظہار کیلئے مختلف بحروں کا انتخاب کر کے نغمگی پیدا کرتے ہیں۔ فارسی مروجہ بحروں کے استعمال کے

Scanned with CamScanner

ساتھ ساتھ میر نے ہندی کے پنگل کو اردو غزل کے مزاج کا حصہ بنا کر ہم آہنگی کی صورت دینے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کی شاعری میں بڑی کیفا آور اور اثر انگیز غنائیت و موسیقی پیدا ہوتی ہے۔ :

پتا پتا، بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

چلتے ہو تو چمن کو چلیے سنتے ہیں کہ بہاراں ہے
پات ہرے ہیں پھول کھلے ہیں کم کم بادو باراں ہے

تصوف

میر کی شاعری کے فکری عناصر میں متصوفانہ رنگ خاص طور پر قابل ذکر ہے ان کے باپ اور چچا صوفیانہ مزاج کے مالک تھے اور راشد ان جذب و مستی کی کیفیات میں سرشار رہتے تھے۔ میر نے ان بزرگوں کی آنکھیں دیکھی تھی۔ وہ بھلا کس طرح صوفیانہ تجربہ سے الگ رہ سکتے تھے۔ ان کے ہاں تصوف کا تجربہ محض روایتی نہیں ہے یہ رسمی بھی نہیں ہے، اس تجربے نے میر کے ذہن و فکر کی تہذیب پر گہرے اثرات مرتسم

دیکھتے ہیں۔ وہ زندگی کو کسی عام انسان کی طرح نہیں دیکھتے
ان کی نظر ایک صاف دل صوفی کی نظر سے ہے۔

موت اک ماندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

سرسری تم جہان سے گزرے
ورنہ ہر جا جہانِ دیگر تھا

حکیمانہ انداز

عام اخلاقی مضامین بھی ہمارے تصوف کے اہم مسائل ہیں
جو لوگ نیکی، شرافت، دیانت، صدق و امانت اور دیگر
چھوٹے چھوٹے اخلاقی مسائل پر اس انداز سے گفتگو کرتے
ہیں کہ ایک طرف تو ان مسائل کی اہمیت واضح ہو جاتی
ہے اور دوسرے ان کا انداز اس قدر دلنشین ہوتا ہے
کہ قاری پر اثر بھی پڑتا ہے۔ میر تقی میر کی شاعری
میں حکیمانہ انداز پایا جاتا ہے جو قاری کو سوچنے
پر مجبور کر دیتا ہے۔ مثلاً:

یہ توہم کا کارخانہ ہے
یاں وہی ہے جو اعتبار کیا

سرسری تم جہان سے گزرے
ورنہ ہر جا جہانِ دیگر تھا

 PTO

تصورِ محبوب

یہ بات تو طے ہے کہ میر نے ایک گوشت پوست کے زندہ و متحرک محبوب سے عشق نہیں، بھرپور عشق کیا تھا اور محبوب سے ان کے احساسِ جمال، قوتِ تخیل اور تصور حسن پر روشنی پڑتی ہے۔ ان کا محبوب خود حسن و نور کا منبع ہے اور روشنی کی طرح شفاف۔ میر کا محبوب صرف روشنی ہی نہیں بلکہ جسم، خوشبو اور رنگ و بو کا پیکر بھی ہے۔ وہ مادی کثافتوں سے منزہ اور حسن محض ہے۔ مثلاً:

ان گل رخوں کی قامت لہکے ہے یوں ہوا میں
جس رنگ سے لچکتی پھولوں کی ڈالیاں ہیں

کھلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے
اس کی آنکھوں کی نیم خوابی سے

اس عہد میں الٰہی محبت کو کیا ہوا
چھوڑا وفا کو ان نے مروت کو کیا ہوا

تصورِ عشق

میر کے ہاں عشق آداب سکھاتا ہے، محبوب

کی عزت و تکریم کا درس دیتا ہے۔ اگر عشق اس کا
انجام ہمیشہ المیاتی اور دردناک ہوتا ہے۔ پھر بھی
میر کو اس عشق سے پیار ہے۔ یہ عشق ان کی زندگی کا
ماحاصل ہے۔ اس عشق سے میر نے زندگی کا سلیقہ
اور حوصلہ سیکھا ہے۔ اسی عشق نے ان کی زندگی میں
حرکت و عمل اور جہل پیدا کی۔ میر کے خیال میں زندگی
کی ساری گہما گہمی اور گوناگونی اسی عشق کی وجہ سے ہے
اگر عشق نہ ہوتا تو یہ کارخانہ قدرت بے کار، خاموش،
بے حرکت اور بے لذت ہوتا۔ لہٰذا عشق کے حوالے سے
ان کے نمائندہ اشعار درج ذیل ہیں:

دور بیٹھا غبار میر اس سے
عشق بن یہ ادب نہیں آتا

محبت ہی اس کارخانے میں ہے
محبت سے سب کچھ زمانے میں ہے

ہم طورِ عشق سے واقف نہیں ہیں لیکن
سینے میں جیسے کوئی دل کو ملا کرے ہے

سہلِ ممتنع

میر کی سہل ممتنع کے بارے میں اثر لکھنوی کہتے ہیں کہ:

"زندگی کا شاید کوئی پہلو ہو
جس کی مصوری میر نے نہ کی ہو"

الفاظ میں اور موثر ترین پیرائے میں
شاعری کی ہے۔ ان کے اشعار سہل ممتنع ہیں۔"

سرسری تم جہان سے گزرے
ورنہ ہر جا جہانِ دیگر تھا

سب پہ جس بار نے گرانی کی
اس کو یہ ناتواں اٹھا لایا

سارے عالم پر ہوں میں چھایا ہوا
مستند ہے میرا فرمایا ہوا

احساس برتری

میر کی شاعری کا ایک مخصوص رنگ ہے اور انداز شعر گوئی کی کیفیات ہیں جس نے تمام شاعروں کو بے حد متاثر کیا اور سارے شاعروں نے اس رنگ میں شعر کہنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکے۔ اس لیے میر احساسِ برتری کو سامنے لاتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

سارے عالم پر ہوں میں چھایا ہوا
مستند ہے میرا فرمایا ہوا

گفتگو ریختے میں ہم سے نہ کر
یہ ہماری زبان ہے پیارے

پڑھتے پھریں گے گلیوں میں ان ریختوں کو لوگ
مدت رہیں گی یاد یہ باتیں ہماریاں

بقول ڈاکٹر سید عبداللہ :

"بعض صاحب کمال ایسے ہوتے ہیں
جن کے فن کی نمایاں خصوصیت
نہ صرف اپنے دور کو متاثر کرتی
ہے بلکہ مستقبل میں بھی لوگ ان
کی طرز خاص کو مانتے ہیں میر
بھی ایسے ہی صاحب کمال ہیں۔"

مجموعی جائزہ

مولوی عبدالحق فرماتے ہیں کہ :

"میر تقی میر سرتاج شعرائے اردو ہیں۔
ان کا کلام اسی ذوق و شوق سے
پڑھا جائے گا جیسے سعدی کا کلام
فارسی میں، اگر دنیا کے ایسے
شاعروں کی ایک فہرست تیار کی جائے
جن کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا تو
میر کا نام اس فہرست میں ضرور داخل
ہوگا۔"

بقول رشید احمد صدیقی :

"غزل شاعری کی آبرو ہے اور میر غزل
کے بادشاہ ہیں۔"

ایک اور جگہ لکھتے ہیں کہ :

"میر کی بات دل سے نکلتی ہے اور سامع
کے دل میں جگہ کر لیتی ہے۔"

Scanned with CamScanner